ABSTRACTS

Cultural Effects Founding Literary Movement

In this article cultural system is discussed keeping in view the creation of culture under which a language coins its vocabulary. Change in cultural utility and its systems lead to change in language and this change in language when collides with the systems of knowledge and literature of a culture it transfers its dynamics into it. This starts a new debate which undergoes a process to give rise to a new movement. The researcher takes the meaning of culture for a daily livings, this moves literature in a pertinent direction. Culture is always a changing process, so literature is subject to change.

نسیم اختر
ڈاکٹر عطش درانی

ثقافتی اثرات سے ادبی تحریکات کی تشکیل کا مطالعہ

ثقافت انگریزی کے لفظ Culture کا مترادف ہے جو وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مختلف میدانوں، مضامین اور ڈسپلن میں اس کے مختلف معنی لیے جاتے ہیں۔ کے ای ایل کروبر کے نزدیک اس کے معنی ۱۲۷ کے قریب ہیں۔ ای جی ٹیلر نے ایک جامع تعریف میں کہا ہے کہ: ''ثقافت اس کل مجموعے یا ضابطے کا نام ہے جس میں مذہب، عقائد، علوم، فنون، اخلاقیات، عادات، رسوم اور وہ تمام رجحانات و امور شامل ہیں جو انسان اکتساب کے بعد انجام دیتا ہے۔''[۱] ہم اسی تعریف کو بنیاد بنا کر آگے چلتے ہیں۔

بشریات میں ثقافت مخصوص جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگوں کا وہ طرزِ زندگی و طریقِ عمل ہے جو انھوں نے بحیثیت مجموعی ایک مدت تک سیکھ کر اپنائے رکھا۔ خواہ وہ مہذب (Civilized) ہو یا وحشی۔ یعنی شہری (Civil) ہو یا جنگلی وہ ثقافت ہی کہلائے گی۔ یہ ثقافت لوگوں کے کلی رہن سہن، طرز بود و باش یا اندازِ فکر کے اظہار کا نام ہے۔ یہ اجتماعی اظہار ہے۔ اجتماع کے طرزِ حیات میں کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، یعنی اطوارِ رہایش، لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ، اندازِ تعمیر اور اخلاقیات شامل ہیں۔ یہ اخلاقیات جو اَمر و نہی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں آرٹ اور فنونِ لطیفہ کو بالخصوص ثقافت کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ جس میں شاعری، موسیقی، رقص، ڈراما اور پینٹنگ آرٹ شامل ہیں۔ آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے یہ گوشے ثقافت کے ظاہری پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس گوشے کا ایک جزوی حصہ دستکاریاں بھی ہیں۔ کیوں کہ فنون لطیفہ میں دستکاریاں کسی جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگوں کی مخصوص امتیازی پہچان ہوتی ہے۔ اس مجموعی صورت حال کے بارے ڈاکٹر عطش دُرّانی لکھتے ہیں:

''انسانوں کے طریق زندگی یا اس کل مجموعے یا طرزِ حیات کو کہا جاتا ہے، جو انسان غیر جبلی طور پر یعنی سیکھ کر انجام دیتا ہے...طرز معاشرت یا طریق زندگی کے تمام تر نمونے آجاتے ہیں۔''۲

اس حوالے سے سید امجد علی لکھتے ہیں:

''فنون اور دستکاریاں کسی قوم کی روح کی ترجمان ہوتی ہیں۔فنون اور دستکاریاں کسی قوم کے چہرے کو جان دار اور ابلاغی بناتے ہیں اور ان کے بغیر قومی چہرہ سپاٹ اور بے حس ہو جاتا ہے۔کوئی قوم جس وقت سڑکیں اور قانون بناتی ہے یا کسی قوم سے تجارت کر رہی ہوتی ہے تو درحقیقت اپنی ثقافت کا اظہار کر رہی ہوتی ہے۔البتہ دوسرے لوگ اسی وقت، کسی قوم کی ثقافت کی حقیقی روح تک پہنچنے میں کام یاب ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اس کے نغمات سنیں یا اس کے فنون اور دستکاریاں دیکھیں۔''۳

کسی بھی مخصوص جغرافیائی حدود یا دوسرے لفظوں میں کسی ملک کی ثقافت کو جاننا یا سمجھنا دراصل کسی قوم کو سمجھنا اور جاننا ہے کیوں کہ لوگوں کا ہنسنا، رونا، خوشی و غمی کا اظہار ہی قوموں کی روح کی اصل جھلک ہوتی ہے۔اس لیے زیادہ بہتر ہوگا کہ پہلے ''ثقافت'' کے لفظ و مفہوم کا معنوی، اصطلاحی اور نظریاتی حوالے سے تجزیہ کرتے ہوئے وضاحت کر دی جائے۔کیوں کہ کوئی بھی تحریک جب کسی وسیب سے ابھرتی ہے تو لامحالہ اس کا کلچر بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔زوار حسین لکھتے ہیں:

''کلچر ایک لاطینی لفظ 'کلٹ' سے ماخوذ ہے۔ماضی بعید میں 'کلٹ' سے مراد محدود اور مختصر پیمانے کی مقامی رسم و روایات پر مبنی معاشرتی تنظیم کا تصور تھا۔''۴

جب کہ ایک اور تحقیق میں اس کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

''کلچر جرمن زبان کے لفظ کلٹور سے ماخوذ ہے۔جس میں جوتنے، بونے اور اُگانے کا استعارہ پایا جاتا ہے مگر جو کچھ جوتا جاتا ہے وہ زمین نہیں انفرادی اور اجتماعی ذہن ہے جو کچھ بُویا جاتا ہے، بیج نہیں تصورات ہیں اور جو کچھ اُگایا جاتا ہے وہ اناج کی فصل نہیں بلکہ یکسانی کردار کا وہ نمونہ ہے جس کی بدولت کسی گروہ میں وحدت کا شعور راسخ ہوتا ہے۔''۵

عکسی مفتی نے اپنی کتاب (۲۰۱۷ء) میں بھی یہی تعریف کی ہے کہ: ''ثقافت لوگوں کے مشترکہ اندازِ زندگی کا نام ہے۔''۶

یعنی کسی بھی سماجی عمل میں یکسانیت، ثقافت کا دوسرا نام ہے جس کی بنیاد کے یکساں مقاصد ہوتے ہیں، جو سماجی گروہ کی اقدار سے پہنچتے ہیں اور: ''کلچر سے اقدار کا وہ نظام مراد ہے۔جس کے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے... روزمرہ دنیاوی زندگی میں بعض خیالات یا اشیاء اہم سمجھتے ہیں بعض غیر اہم۔بعض کو ہم عزیز جانتے ہیں بعض کو حقیر گردانتے ہیں۔انھی ترجیحات کو اقدار کہتے ہیں اور انھی کے عملی اظہار سے ہماری سماجی زندگی کا نقشہ بنتا ہے۔''۷

سماجی گروہ کا تعلق بشر سے ہے۔لہٰذا کلچر کا سماجیاتی بشریات کے مفہوم کے تحت بھی تجزیہ ضروری ہے کیوں کہ حقیقتاً ثقافت کا مطالعہ سماجیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ علم الانسان اور سماجیاتی بشریات کا مطالعہ و تجزیہ ہے۔اب اس وسیع دائرۂ عمل یا کینوس کو سامنے

رکھتے ہوئے ''ثقافت'' کا مفہوم جانا جائے تو:

''ثقافت (کلچر) ہماری تہذیب اور تمدن کی اعلیٰ ترقی ہے۔ اس ترقی میں طبعی، ذہنی اور روحانی ترقی آ جاتی ہے۔ یہ ترقی تربیت اور تجربے پر منحصر ہوتی ہے۔''۸

اس میں ایک بات بڑی صراحت کے پیش نظر کی گئی ہے جیسا کہ سبط حسن نے بھی کہا تھا تہذیب کی بنیاد کلچر پر ہے۔ لامحالہ تہذیب اور تمدن دو ایسے عوامل ہیں جو کلچر کے ذریعے نشو و نما پا کر مادی دور کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے روحانی تسکین کا بھی سامان کرتے ہیں۔ بشریات کے ماہر کارٹر وی گڈ (Carter V Good) ثقافت کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

''ثقافت کسی گروہ، جماعت اور قوم کی معاشرتی، اخلاقی، ذہنی، فنی اور صنعتی خوبیوں کا ایسا مجموعہ ہے۔ جس کی مدد سے کسی گروہ، جماعت یا قوم کی حیثیت سے کسی دوسرے گروہ یا جماعت سے الگ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس کی مدد سے اس گروہ، جماعت یا قوم کے نظریوں، عملوں، اصولوں اور دستور کا پتہ چلتا ہے۔''۹

جب کہ فیض احمد فیض، ثقافت کے بنیادی اجزا کی بات کرتے ہیں:

''اول وہ عقیدے، قدریں، افکار، تجربے، اُمنگیں یا آدرش، جنھیں کوئی انسانی گروہ یا برادری عزیز رکھتی ہے۔ دوم وہ آداب، عادات، رسوم اطوار جو اس گروہ میں رائج اور مقبول ہوتے ہیں۔ سوم وہ فنون مثلاً ادب، موسیقی، مصوری، عمارت گری اور دستکاریاں جن میں یہی باطنی تجربے، قدریں، عقائد، افکار اور ظاہری طور اطوار بہت ہی مرصع اور ترشی ہوئی صورت میں اظہار پاتے ہیں۔''۱۰

ڈاکٹر سید عبداللہ کلچر کو انسان کا ماحولِ ثانی قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''کلچر تو ہوتا ہی وہ ہے جو نسلاً بعد نسل عمل و تعامل سے شکل پذیر ہوتا ہے۔ میں اینتھرو پالوجی والوں کے اس خیال سے متفق ہوں کہ کلچر انسان کے ماحول ثانی کا نام ہے اور ماحول ثانی مسلسل ارتقاء کرتا رہتا ہے... کلچر مادی ماحول میں حسن پیدا کرنے کا نام ہے اور حسن پیدا کرنے والی قوت انسان کے باطن میں ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''۱۱

جبلتی انداز میں شعوری اور لاشعوری طور پر انسان نے زندگی گزارنے کے کچھ اصول بنائے، گزر بسر کے کچھ نصب العین مقرر کیے، رہن سہن کے طریقوں میں کچھ وضع و اطوار سیکھے اور پھر سکھائے، (یعنی مستقل اپنی زندگیوں کا لازمی جزو بنا لیا) جن کی وجہ سے کچھ قوانین، عقائد، ریتیں اور رسمیں وضع ہوئیں، جو اکتسابی انداز میں نسل در نسل مسافت کرتی رہیں۔ جو کچھ عملی بھی تھیں اور زبانی یعنی Oral بھی، جو آگے چل کر Oral History اور Oral Folk Literature کی صورت نمودار ہوئیں۔ نظریات و تصورات نے فن اور آرٹ کو متصور کیا۔ ان سب چیزوں نے نظریات و عقائد کو جنم دیا، ان تمام متذکرہ بالا چیزوں نے انسان اور سماج کے درمیان تنظیم کا ایسا رشتہ اور واسطہ تخلیق کیا جو ان میں یکسانیت کا مظہر بنتا ہے اور اسی کا نام ثقافت یا کلچر ہے۔ اس ثقافت میں ایک لچک ہوتی ہے۔ جو مزید نئے نظریات، عقائد، رسم و رواج، فن و آرٹ، دستکاریاں، رہن سہن کے طریقوں وغیرہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انھی وجوہات نے دنیا میں یہ نعرہ دیا کہ ''پوری دنیا ایک گلوبل ولیج (Global Village) کی مانند ہے۔ کسی بھی

ملک میں کوئی اقتصادی، سیاسی، سماجی تبدیلی آتی ہے تو غیر مشروط طور پر سماجیاتی بشریات اس سے متاثر ہوتی ہے اور بلا واسطہ اس کے کلچر یا ثقافت پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اس ثقافتی لچک کی وجہ سے ہے جو سماج کے رَد و قبول سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ جس کی طرف اے، کے اوٹاوے رالف لنٹن کا حوالہ دیتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں:

''کلچر نام ہے اکتسابی کرداری عمل کی ایک خاص وضع ترکیب اور اس کے نتائج (Configuration) کا، جس کے عناصر ترکیبی کسی مخصوص سماج کے تمام اراکین میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں اور مشترکہ طور پر منتقل بھی ہو جاتے ہیں۔''[۱۲]

اس بات کی کئی ایک مثالیں پاکستانی ثقافت میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ علاقائی ثقافت میں پنجاب میں شادی بیاہ کے موقعے پر دونوں خاندانوں کی خواتین گیت گاتی تھیں جس میں مقابلے کی فضا پیدا ہوتی جو اپنائیت پر ختم ہوتی۔ مگر آج اکثر شادیاں شادی ہال میں ہوتی ہیں۔ پُر تکلف ماحول میں ڈیک پر موسیقی کی دُھنیں بجائی جاتی ہیں اور بعض طبقوں میں ناچ کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ یہ کلچر سندھ اور پنجاب کی ثقافت نے پڑوسی ملک سے اکتساب کیا ہے۔ اس تبدیلی کو سماج نے قبول کر لیا ہے۔ اس ثقافتی اکتساب میں صدیوں سے مروج شادی بیاہ کی چھوٹی چھوٹی رسمیں ختم ہو گئیں ہیں۔ اس طرح ذات و برادری کی جکڑ بندیاں کمزور پڑ گئیں اور ثقافت تغیر پذیر نظر آتی ہے۔ کھانے پینے کی عادات میں تبدیلی جہاں سماجی اقتصادیات کا اہم پہلو ہے۔ وہاں ثقافت کا یہ دائرہ روبہ تغیر ہے۔ لسّی کی جگہ کولڈ ڈرنک نے لے لی اور سادہ دیسی غذائیں تعیش میں چلی گئیں۔

ثقافت میں تغیر پذیری دراصل یکسانیت کی متضاد کیفیت ہے جو کسی بھی نئی ریت کو اپنانے کی تحریک ہے اور انسانی جبلت کا پَرتو ہے۔ دراصل ''انسانی تمناؤں اور تقاضوں کی تکمیل کا دوسرا نام ثقافت ہے۔ ثقافت ہی انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تحرک اور رفتار مہیا کر کے، ان کو اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کا سبق سکھاتی ہے۔ ماحول سے ہم آہنگ ہونے کے لیے بنی نوع انسان نے کئی قسم کے وسائل ایجاد کیے اور انھیں استعمال کرنے کا ڈھنگ دوسروں کو بھی سکھایا۔''[۱۳]

چوں کہ اب تہذیب کا دور شروع ہو چکا ہے اور مہذب ثقافت ہی زیرِ بحث آتی ہے، اس لیے عام طور پر تہذیب ہی کو بشریاتی ثقافت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پکتھال سے لے کر سید مودودی تک یہی مترادف استعمال میں لاے جاتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے ''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔'' جب کہ اس کی تفسیر کچھ یوں بیان ہوئی ہے کہ رب العزت نے انسان کو اچھی شکل و صورت میں، صحیح قد و قامت میں، عمدہ فہم و فراس، بہترین دانائی اور عقل و فکر میں، متناسب اعضاء میں، کمال حسن و جمال میں اور سہانے چہرے والا پیدا کیا۔''[۱۴]

عقل و فکر کے احاطے میں لطیف جذبات، اعلیٰ افکار اور حسن و جمال آتے ہیں۔ عمدہ فہم میں خارجی و باطنی نظریات میں توازن رکھنا شامل ہے۔ اس بات کو مختصراً اگر یوں بیان کیا جائے کہ بامقصد سماجی، ازدواجی و اخلاقی اقدار اور لافانی تخلیقات، تہذیب کے مظاہر ہیں، تو درست ہوگا۔ سبطِ حسن اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر واحساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات، اوزار، پیداوار کے طریقے، سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم وادب، فلسفہ، عقائد، عشق ومحبت کے سلوک، خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے احاطے میں آتے ہیں۔''۱۵

لیکن فیض احمد فیض نے تہذیب اور کلچر کو ہم معنی قرار دیتے ہوئے ایک اہم نقطہ کشید کیا ہے کہ لفظ ''تہذیب'' اردو میں رائج ہے۔ کلچر انگریزی میں بولا جاتا ہے، جس کے معنی ذہنی وفنی کمالات اور کارنامے اور کرشمے ہیں، جب کہ بحیثیت مجموعی تہذیب وثقافت بھی استعمال ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہماری زبان (اردو) میں 'کلچر' کا ہم معنی لفظ موجود ہی نہیں۔ یعنی وہ لفظ جس کو ہم بالکل اس کا مترادف کہہ سکتے ہیں ہمارے ہاں موجود ہی نہیں۔ میں ثقافت کی بجائے پرانا لفظ ''تہذیب'' استعمال کروں گا۔۔۔۔اردو میں کلچر کے ہم معنی موجود نہ ہونے پر ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ آج سے دوسو برس پہلے خود انگریزی میں بھی یہ لفظ موجود نہیں تھا۔''۱۶

تہذیب کے ضمن میں ہمارے روزمرہ میں یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی نامناسب طرزِ عمل اپنائے تو کہا جاتا ہے۔ ''آپ کو بولنے کی تہذیب نہیں'' یعنی تہذیب کا تعلق اخلاق، عزت واحترام اور سلیقہ وغیرہ سے ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں خاندان بڑا مہذب یا تہذیب یافتہ ہے تو اس سے ہماری مراد شائستگی واحترام سے ہوتی ہے۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، بات چیت کرنے اور چھوٹے بڑے کی عزت واحترام روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر وزیر آغا نے تہذیب اور کلچر کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ ان کے خیال میں تہذیب اور ہے اور کلچر دیگر۔ وہ کہتے ہیں:

''کلچر اور تہذیب میں وہی فرق ہے جو بیج کے مغز اور اس کے چھلکے میں ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ کلچر گاڑھی خوشبو کا وہ حلقہ ہے جس کے مرکز میں کوئی پھول ہمیشہ ہوتا ہے مگر جب ہوا چلنے پر یہی گاڑھی خوشبو رقیق سی ہو کر چاروں طرف پھیل جاتی ہے تو تہذیب کہلاتی ہے۔''۱۷

دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کلچر بنیادی طور پر سماجی ارتقا کی پیداوار ہے، جب کہ تہذیب رسومات، رواج، مذہبی امور، قوانین، ضوابط اور اصولوں کے تابع ہے۔ ویسے بھی کلچر کے لغوی معانی کاٹ چھانٹ کرنا، بدشکل کو خوش شکل بنانا، مشاطگی کرنا ہے۔ ادیب اپنی تخلیقات کو جو اپنی ذات کے گھنے جنگل کے اندر چھپی ہوتی ہے، تراش خراش کر کے صفحۂ قرطاس پر لاتا ہے۔ تو وہ اپنی تخلیق کو کلچر کرتا ہے۔ تہذیب، کلچر کے پھیلاؤ کو کہا جاتا ہے۔ یہ تہذیب کی وہ صورت ہے جو بنیادی طور پر تخلیقی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے نام ایک خط میں معاشرے میں مہذب اور غیر مہذب انسانوں کے مابین فرق سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''تہذیب کیا ہے۔ اسے سمجھنا فی الواقع بہت مشکل ہے پھر بھی عمدہ عمارتیں، عمدہ تصاویر اور کتابیں بلکہ ہر وہ چیز جو خوب صورت ہو، تہذیب کی علامت ہے مگر سب سے اچھی علامت ایک عمدہ انسان ہے جو بے غرض ہو اور دوسروں

کے ساتھ مل کر بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے کام کر سکے۔'' (ترجمہ)۱۸

اس بات کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ تہذیب کے دائرہ کار میں زبان، آلات، اوزار، پیداوار کے طریقے، سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ، حکمت، عقائد، مذہب، جادو ٹونے، اخلاق و عادات، رسوم و رواج حتیٰ کہ احساسات و جذبات اور روحانی کیفیات وغیرہ بھی آتے ہیں۔ پھر انسانی تہذیب پر سماوی آفات، ماحول اور موسم کا بھی اثر پڑتا ہے۔

اس بحث سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ تہذیب انسانی تخلیق ہے، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انسان مادرِ شکم سے یہ تہذیب سے کر آتا ہے۔ اس کو سماجی فرائض کی ادائیگی، طبعی آلات، نظامِ کر واحساس اور سماجی اقدار اور رویوں کا اظہار تعمیر کرتا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک کا کہنا ہے کہ بے ترتیب درختوں کا جھنڈ جنگل کہلائے گا اور ترتیب سے درخت ہوئے ہوں تو باغ کہلائے گا۔ لہٰذا ترتیب ہی تہذیب کا نام ہے۔۱۹ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کھیتی باڑی کی دریافت اور ابتدائی درجے کی زراعت اختیار کرنے کے فوراً بعد ہی انسانوں کے تمدنی اور تہذیبی معیار میں انقلابی تبدیلیاں شروع ہو گئی تھیں۔۲۰ پہلے زمین کے باسیوں نے بستیاں تعمیر کیں۔ جب صنعت و حرفت نے ترقی کی تو شہر بسائے۔ ان شہروں میں کارخانے لگائے گئے۔ آلات و اوزار بنائے گئے۔ لوگوں کو روزگار ملا، اور فرصت کے اوقات میں میلے ٹھیلے دل بہلانے لگے۔ اس طرح تہذیب و تمدن کو فروغ ملا۔

ثقافت ــــــ بالخصوص ہماری ثقافت کی جڑیں اپنی آفاقیت کے ساتھ اس سرزمین میں پیوست ہیں جہاں ہم رہتے ہیں۔ یعنی ہماری ثقافت کا پودا اس سرزمین سے پیدا ہوا ہے۔ اس میں بسنے والے علم و دانش، فکر و نظر، حکمت و دانش اور تمدن و ثقافت کے وارث ہیں۔ جو کامیابیوں، ناکامیوں، دکھ درد، خوشیاں اور مسرتیں، اپنے احساسات و جذبات، وہبی و کسبی، حسن و جمال کے ساتھ باوقار انداز سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ سارے امور ثقافت کے دائرے میں آتے ہیں۔

ثقافت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے اندر زندگی کے روزمرہ کے امور مثلاً کھانا پینا، گزر بسر، لباس پوشاک، زبان، رسم و رواج، زراعت کے علاوہ انسانی سوچ اور فکر، تخیل اور ذہنی حالات اور روحانی زندگی جیسے امور اس میں شامل ہیں۔ پھر ہماری تباہ شدہ ثقافتیں بھی اس میں آتی ہیں۔ یہ وہ ثقافت ہیں جن پر لوگ فخر کرتے ہیں۔ گویا ثقافت فکر کرنے کی چیز نہیں کیوں کہ یہ تغیر پذیر رہتی ہے۔ جن کا ذکر کتابِ الٰہی میں اس طرح آیا ہے:

> ''اور کتنی ہی بستیوں کو ہم نے تباہ کیا۔ جن کے باسی اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ (یعنی مغرور تھے) سو دیکھ لو ان کے مسکن کھنڈروں کی شکل میں پڑے ہیں۔ جن میں ان کے کوئی نہیں بسا۔'' (ترجمہ)۲۱

ایک اور آیت مبارکہ میں ان تباہ شدہ ثقافتوں سے متعلق فرمایا گیا ہے کہ:

> ''تیرا رب ان بستیوں کو تباہ کرنے والا نہ تھا... اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہوتے۔'' (ترجمہ)۲۲

مذکورہ آیات پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی حیات کی ابتدا اور ارتقا زمین کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب انسان اپنے اور

اپنے ساتھیوں پر ظلم وتعدی کے لیے کمر بستہ ہو جائے تو خالقِ کائنات ایسے لوگوں اور ایسی بستیوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی ثقافت بھی دفن ہو جاتی ہے۔ ثقافت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی تہذیب وتمدن کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر غلام علی الانا نے بشریات کے مختلف ماہرین کے حوالے سے لکھا ہے:

''ثقافت ہماری تہذیب اور تمدن کی اعلیٰ ترقی ہے۔ اس ترقی میں طبعی، ذہنی اور روحانی ترقی آجاتی ہے۔ یہ ترقی تربیت اور تجربے پر منحصر ہوتی ہے۔''۲۳؎

معاشرہ جوں جوں ترقی کرتا ہے، ثقافت بھی اسی نوع ترقی کرتی ہے۔ ثقافت ہی انسان کو اس کی مادی زندگی سے وابستہ رکھتی ہے جبکہ غیر مادی یعنی روحانی و مذہبی زندگی، عبادات، اخلاق، پرہیز گاری اور قانونِ فطرت سے بھی نسبت رکھتی ہے۔ ثقافت سے قوموں کی پہچان ہوتی ہے۔ قوم اگر لاقانونیت کا شکار ہوگی تو وہاں گمراہی پرورش پائے گی اور گمراہی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوگی۔ ایسی صورت میں ایسی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ لوگوں کی زندگیوں میں پھلنے پھولنے والی لوک ریت ہی لوک ثقافت ہے۔

لوک گیت جو ہم صدیوں سے سنتے چلے آئے ہیں، لوک ناچ، جو خوشیوں کے موقعوں پر از خود انسان کے اعضا تھرتھرانے لگتے ہیں۔ اسی طرح لوک داستانیں، لوک کھیل: کبڈی، گلی ڈنڈا، کشتی، اسی جیسی اور بہت ساری روایات صدیوں سے دیہی انسانوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر میلے ٹھیلے، عرس، عید، شب برات، یہ بھی ہماری لوک ثقافت کا حصہ ہیں۔ اسی طرح موسموں کے تہوار بیساکھی، بسنت وغیرہ، لوک تماشے، مداری، بازی گری، لوک ہُنر: کشیدہ کاری، کڑھائی اور ایسے تمام ہُنر جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔

کسی معاشرے میں جو روابط وسلوک، اخلاق و عادات، طرزِ بود و باش، رسم و رواج، حسن و جمال اور فن و اظہار کے معیار اپنے ارتقا کے بعد رائج ہو جاتے ہیں، وہ دراصل اس معاشرے کی ثقافت ہیں۔ یہ ثقافت نہ تو کسی مجلسِ شوریٰ میں وضع ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی پارلیمنٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے پیچھے صدیوں کی روایات ہوتی ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے ہندوستانی ثقافت تھی مگر مسلمان من حیث القوم الگ ثقافت کے حامل تھے۔ اُن کے ہاں صوفیائے کرام کے عرس، مذہبی تہوار، شادی بیاہ کی مذہبی رسمیں وغیرہ ملتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اسلامی ثقافت اپنی ساخت کے اعتبار سے بہت پہلودار رہے۔ ہندوؤں کے ہاں ذات پات کا نظام زندگی کے ہر حصے پر اثر انداز تھا۔ برہمن کی مذہب پر اجارہ داری تھی۔ دوسری جانب ذات پات کی تمیز ایک انسان کو دوسرے انسان سے دور کرتی رہتی تھی۔ سب سے بڑھ کر دکھ کی بات یہ تھی کہ نیچے درجے کی ذاتوں کے لوگوں کے لیے علم کے دروازے بند تھے جب کہ اسلام نے ان لوگوں کو اپنی آغوش میں لے کر مساوی درجے پر معاشی اور اقتصادی ترقی کے مواقع فراہم کیے۔ (۲۴) یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ پاکستانی ثقافت میں مسلم اور غیر مسلم اجتماعی طور پر بعض امور میں شریک ہیں بعض اسلامی امور بھی ہر دور پر اثر انداز ہوتے ہیں، جیسے ''السلام علیکم''، ''وعلیکم السلام'' یا قرآنی آیات کا ذکر وغیرہ بعض غیر مسلموں کی زبان پر بھی ہیں وغیرہ۔

اس بات کو ذہن میں رکھنا از حد ضروری ہے کہ تہذیب کے زیر اثر آنے والی بہت سی ایجادات ثقافت کے فروغ میں اہم

کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ تہذیبی اور صنعتی عمل سے جو توانائی حاصل کی جاتی ہے۔ وہ ثقافتی عوامل کا ایک حصہ بنتی ہے اور ثقافت مادی ماحول میں حسن پیدا کرنے کا نام ہے اور حسن پیدا کرنے والی قوت انسان کے باطن میں ہے۔ جس کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں عقیدہ، اقدار، امنگیں، آرزوئیں، عشق و محبت، خواہشات وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں دُکھ اور سکھ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔[۲۵]

اس طرح ہماری ثقافت کے اندر ہماری اجتماعی زندگی کے خارجی امور شامل ہیں جن میں زبان سے لے کر دیگر عوامل اور موت تک کے امور شامل ہیں۔ اس طرح ثقافت کی حدیں لاشعور کے طور پر انسان کے خیال اور عمل کی حد تک وسیع ہیں۔ ثقافت نسل در نسل سفر کرتی ہے مگر اس میں تغیر نہیں ہوتا جب کہ تہذیب میں ہمیشہ ارتقا جاری رہتا ہے۔ بشرطے کہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے۔ درج بالا تمام بحث کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ عمل جو کسی فرد یا قوم کو وراثت کے طور پر نسل در نسل ملتا رہے وہ ثقافت کے دائرے میں آتا ہے۔ مگر آج کل پاکستانی ثقافت پر ہندو ثقافت نے یل غار کر دی ہے۔ جس کی تمام تر ذمے داری الیکٹرانک میڈیا پر آید ہوتی ہے۔ ان اسلامی روشن پہلوؤں کو برہنگی نے یوں داغ دار کرنا شروع کر دیا ہے کہ ہماری نسل کو یہ علم ہی نہیں کہ لڑکے لڑکی کی شادی بیاہ سے ایک دو ماہ پہلے دیہات کی خواتین دن بھر کا کام کاج ختم کر کے رات کو شادی کے گیت گانے جمع ہو جایا کرتی تھیں، اور یہ گیت جوانی سے سفر کرتے کرتے بڑھاپے تک جاتے تھے۔ گیتوں کے اختتام پر گُڑ تقسیم کیا جاتا تھا۔ آج ہماری ثقافت کا یہ پہلو لاوڈ اسپیکر پر فلمی گانے نشر کرنے پر منحصر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ثقافت تو درکنار ہم اپنی لوک ثقافت و شناخت کو گم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

ثقافت اور مذہب:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ثقافت اور مذہب کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ہر تمدن، تہذیب اور ثقافت کی بنیاد معنویت کے اعتبار سے مذہبی عقائد پر استوار ہوتی ہے۔ اگر کسی ثقافت کی بنیاد میں مذہبی عنصر نہ ہو تو پھر بھی کسی نہ کسی مذہبی روایت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ عماد الحسن نے اس کی ایک مثال کچھ اس طرح پیش کی ہے کہ:

> ''قدیم تاریخ میں رومی تمدن کی مثال اس طرح ہے کہ بادشاہ کی پرستش کے مسلک نے تہذیبی اور ثقافتی سانچے میں مذہب کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔''[۲۶]

اس طرح ہر ثقافت میں مذہبی تصورات اور تخیلات پوری توانائی کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ پھر وہ معاشرے کی پوری زندگی کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ جیسے ولادت، عائلی نظام، موت، شادی بیاہ اور دکھ درد وغیرہ پر مذہب کا پوری طرح مظاہرہ ہوتا ہے۔ مذہب نے کبھی کبھی اپنے ماننے والوں پر ظلم و ستم کا مظاہرہ بھی دیکھا لیکن ان کے ردِ عمل میں جو احتجاج ہوا اس میں مذہب نے زبردست کردار ادا کیا جو کسی اور تحریک نے نہیں کیا۔ اس امر کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب نے انسان کو سکونِ قلب، روحانی طمانیت اور کڑے حالات کی شدت کو برداشت کرنے میں جو قوت عطا کی ہے وہ کوئی اور تحریک، رجحان اور اِزم فراہم نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹرعبدالسلام خورشید بھی مذکورہ نظریے کے موید ہیں کہ مذہب تاریخ اور جغرافیہ، ثقافت کے ارتقا میں معاون ثابت ہوتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

''جب سے انسانی معاشرے میں بستی، قبیلے یا دیس کے روپ میں منظم زندگی کا آغاز ہوا ہے، ثقافت کی بنیاد مذہب ہی رہا ہے۔ کسی زمانے میں مذہب جادوگری اور اوہام کا دوسرا نام تھا... پھر توحید کے تصور نے مذہب کو نیا رنگ دیا۔'' ۲۷

اس طرح زندگی کا سارا نظام مذہب کے تابع رہا۔ روحانی اور جذباتی زندگی کے اثرات معاشرتی زندگی پر بھی پڑے۔ شہروں میں بسنے والے لوگوں کا رہن سہن دیہی علاقوں سے جداگانہ ہوتا ہے۔ پہاڑوں کے لوگوں کا رنگ وروپ الگ ہوتا ہے۔ جب کہ میدانی علاقوں کا تمدن یکسر مختلف ہوتا ہے۔ ریگ زاروں میں آباد لوگوں کی زندگی کا مزاج جدا ہے۔ صنعتی انقلاب نے دیہاتی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یوں شہر زیادہ آباد اور وسیع ہونے لگے۔ لوگوں کے باہمی امتزاج اور میل جول نے زندگی میں نئی ثقافت کو نیا روپ دیا۔ مذہب اور معاش نے بھی سرگرمی دکھائی۔ چنانچہ انسانوں کے میل جول سے اخلاقی قدریں بدلیں۔ روایات نے جنم لیا۔ محبت واخوت پیدا ہوئی۔ تفریح گاہیں آباد ہونے لگیں۔ مہمان نوازی میں نیا رنگ بھرا۔ اس طرح ایک قومی تشخص نے جنم لیا۔

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اس کا سب سے بڑا ورثہ اسلامی ثقافت قرار دیا گیا ہے۔ یہ بجا ہے کہ اگر ثقافتی تشخص موجود نہ ہوتا تو پاکستان وجود میں نہ آتا۔ اس ثقافت کی بنیادیں ہندعرب ثقافتی ڈھانچے میں مضمر ہیں۔ جس میں ہڑپہ، ٹیکسلا اور گندھارا شامل ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دور کی تہذیبیں اور ثقافتیں ان کے وجود کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں؟ ہرگز نہیں ثقافت تو نسل در نسل آگے چلتی ہے اور مذہب ان کا ہم راہی ہوتا ہے۔ ہاں البتہ اس وقت کی ثقافت کی شکل کچھ اور تھی جو بدلتے ہوئے معاشرتی رویوں کے ساتھ چلتے چلتے ہم تک پہنچیں۔ اس دور کی یادگاریں ہماری میراث کا حصہ ہیں لیکن اس وقت کی ثقافت اور آج کی پاکستانی ثقافت میں فرق ہے۔ ڈاکٹر ممتاز حسین نے اس کی ایک مثال پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''موہن جوڈرو کی منصوبہ بندی قابل تعریف ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارا عقیدہ پروہت راجا کے عقیدے سے مختلف ہے۔ وہ سورج کا پجاری تھا اور ہمارا ایمان ایک ایسے خدا پر ہے جس کی سورج پر بھی حکمرانی ہے۔'' ۲۸

مذہب کے حوالے سے سید مودودی نے ''اسلامی تہذیب اور اس کے مبادیات'' میں فکری سرچشمے کے حوالے سے ثقافت کو تہذیب کے معنی میں برتا ہے اور اس کے پانچ عناصر ا۔ تصور حیات، ۲۔ آئیڈیالوجی، ۳۔ بنیادی عقائد، ۴۔ اخلاقی تربیت اور ۵۔ اجتماعی نظام قرار دیے ہیں۔ ۲۹

مگر یہ پانچوں مثالیں ثقافت کی بنیادوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اگرچہ عکسی مفتی اسے کسی اور طرح سے لیتے ہیں:

"Islam is a cultural compulsion of people of Pakistan. It is a

popular folk sentiment of the masses."[30]

ترجمہ: اسلام۔ پاکستان میں بسنے والوں کی ایک ثقافتی مجبوری ہے۔ یہ عوام الناس میں پایا جانے والا ایک جذبہ، رجحان یا احساس ہے۔

پھر بھی پاکستان کی ثقافتی بنیاد اسلام پر ہے جسے دیگر مذاہب کے ماننے والے پاکستانی بھی میل جول میں انجام دیتے ہیں۔ اسلامی ثقافتی مادی میراث کو چھے بڑے درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔	فنِ تعمیر	۲۔	مخطوطات اور خطاطی کے نادر نمونے
۳۔	نقاشی	۴۔	سنگ تراشی
۵۔	سفال سازی	۶۔	فنونِ لطیفہ

فنِ خطاطی ہمارا مذہبی ورثہ ہے جسے مسلمانوں نے عظیم فن کی شکل دی۔ خصوصاً قرآنی آیات کو اتنا خوبصورتی سے آراستہ کیا کہ مسلمان گھرانے ان آیاتِ قرآنی کو بہ طورِ تحفہ اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔

اب یہاں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ پاکستان کے ثقافتی اجزاء وہی ہیں جو آج سے تقریباً چھے ہزار سال پہلے وادیٔ سندھ کی تہذیب میں موجود تھے۔ اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربی تہذیب سے متاثر وادیٔ سندھ کی تہذیب کے شواہد آج کے پاکستانی معاشرے میں صاف نظر آتے ہیں۔ موہن جودڑو سے ملنے والی تختیوں پر جس بیل گاڑی کی تصویر کندہ ہے، وہ آج بھی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے کھیتوں میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس پاکستانی ثقافت میں ہماری بے شمار مذہبی روایات ملتی ہیں، جس کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

ثقافت اور زبان و ادب:

کسی معاشرے میں جو بھی ثقافتی عناصر ہوتے ہیں ان کے منظّم نظام میں زبان ہی واحد عنصر ہے جو معاشرے کے امتیاز کو بلند کرتا ہے۔ ثقافت کے کئی نظام ہیں، جس پر وہ مشتمل ہوتی ہے۔ ان سب میں زیادہ زبان کا دخل ہے۔ جو سماجی تنظیم اور مذہب کو فروغ دیتی ہے۔ نظریاتی طور پر جب کوئی انسان ثقافت کی بات کرتا ہے تو دراصل وہ زبان دانی کے طریقِ کار کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ حقیقتاً زبان ایک ایسی دولت ہے جو ہمیں شرفِ انسانیت عطا کرتی ہے اور ہم حیوانات کے ساتھ مختلف انواع سے اشتراک رکھتے ہیں مگر جس خصوصیت سے حیوانات محروم ہیں وہ ہے قوتِ نُطق، جس کی بنا پر انسان کو حیوانِ ناطق کہا گیا ہے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو زبان ایک معاشرتی عمل ہے۔ ڈاکٹر مظفر ملک ان خیالات کی تائید میں لکھتے ہیں کہ:

''زبان ہماری ثقافت کا لاینفک حصہ ہے۔ جس کے ذریعے ہم اپنے بچپن میں اپنی ثقافت کے بنیادی اصول سیکھتے ہیں۔ پس زبان کے مختلف نقوش کم از کم الفاظ اور ان کے معانی ہماری ثقافتی بنیادوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔''[31]

جب کبھی چھینک آئے تو بے ساختہ زبان سے ''الحمدللہ'' نکلتا ہے۔ جب انسان کوئی سانحہ دیکھتا ہے تو غیر ارادی طور پر کہتا

ہے ''لاحول و لاقوۃ'' ان تراکیب کا استعمال نہ صرف ہمیں اپنی ثقافت کی طرف لے کر جاتا ہے بلکہ کائنات کے نظریے کی تشریح بھی کر رہا ہے۔ اس طرح انسان جیسے جیسے ترقی کرتا چلا گیا زبان اس کا ساتھ نبھاتی گئی۔ حتیٰ کہ ثقافت اور زبان کے ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن گئے۔ زبان کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ اردو زبان ایک ضرب المثل ہے ''جیسا دیس ویسا بھیس'' اسی طرح زبان بارے کہا جاتا ہے ''جیسی زبان ویسی ثقافت'' اسی لیے زبان ثقافت کی ایک اہم علامت ہے۔ زبان ہی سے انسان دوسرے انسان سے رابطہ پیدا کرتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے۔ ڈاکٹر غلام علی الانا کا کہنا ہے کہ:

> ''معاشرے میں ایک جیسی طبعی حالتوں کے اندر زندگی گزارنے والے انسانی گروہوں کی ایک ہی تہذیب وتمدن کی ڈوری سے موتیوں کی طرح پروئے رکھنے کا کام زبان ہی انجام دیتی ہے۔ اس اعتبار سے اگر کسی ثقافت کو اپنے معاشرے کا عکس کہا جائے تو زبان کو اس معاشرے کی روشن تصور کرنا ہوگا۔'' ۳۲

زبان اگرچہ ثقافت کا عنصر نہیں ہوتی مگر اس کے سلینگ اور محاورے ثقافت سے ضرور اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اس کا بیان اکثر اہلِ علم نے کیا ہے، مگر چوں کہ یہ انسان کے وجود کا حصہ ہوتی ہے، اس لیے یہ انسان کے ساتھ ساتھ سفر کرتی اور ثقافت کو منتقل کرتی ہے۔ زبان اگر کمزور ہوگی تو ثقافت بھی لاغر ہوگی۔ زبان ہی ثقافت کو ہمیشہ پروان چڑھاتی ہے۔ اس لحاظ سے انسانی زندگی میں زبان کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی کہ ثقافت کی۔ زبان ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے تمام ہنر اور تجربات نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں اور اپنے ہم عصر انسانوں سے زبان کی وساطت سے اکتساب کرتے ہیں۔ اگر اکتساب کا یہ عمل نہ ہو تو ارتقاء کا عمل رُک جاتا ہے۔ اس کی عام سی مثال یوں ہوسکتی ہے کہ اگر انسانوں کے مابین عمل تکلم نہ ہو تو رشتوں کا تقدس کوئی کسی کو نہیں بتا سکتا، اس طرح مذہبی امور بغیر کلام کیے انجام نہیں پا سکتے۔ جو انسان عمل تکلم سے محروم ہوتا ہے وہ اشاروں کی زبان سے کام لیتا ہے۔ اس لیے زبان فی الحقیقت اشارات کا مجموعہ بھی ہے۔ ہر ثقافت کے اپنے لسانی تجربات ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ:

> ''ابوالکلام آزاد کی نثر، مولانا ظفر علی خان کے اداریے اور غالب کے خطوط مختلف ثقافتی اندازِ فکر کے ترجمان ہیں۔ اسلوب، ثقافت اور ثقافتی ضروریات کے تحت تشکیل پاتا ہے۔'' ۳۳

زبان کی وسعت، ثقافت کی وسعت کی ضامن ہوتی ہے۔ زبان کا دامن جتنا وسیع آج ہے پہلے نہ تھا۔ الفاظ کا پھیلاؤ پہلے سے زیادہ ہے۔ اس سے مطالب کی ادائیگی زیادہ مرغوب اور آسان ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری ثقافت کا پھیلاؤ بھی زیادہ ہے اور ارتقا بھی فروغ پذیر ہے۔ سرائیکی زبان میں ہر دور میں ہزاروں الفاظ کا اضافہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ مثلاً عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبان کے الفاظ در آئے۔ جس سے زبان کے بھنڈار میں اضافہ ہوا۔ جیسے فریج، موٹر سائیکل، موبائل، ہیٹ، ٹائی، کوٹ وغیرہ انگریزی الفاظ ہیں۔ چُق، چمچہ، چاقو وغیرہ ترکی، قلم، مشروب، ارض وغیرہ عربی۔ قلم دان، گل دان، فنکار، نشتر وغیرہ فارسی، گھاٹ، گیان، دیو وغیرہ ہندی۔

الغرض ہر زبان کا ہر لفظ اپنے ساتھ اپنی ثقافتی تاریخ بھی ساتھ لاتا ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ بعض الفاظ ''تت سم''

ہوتے ہیں کہ وہ وہی معانی دیتے ہیں جس زبان سے وہ لفظ آیا ہو۔بعض الفاظ دوسری زبان میں دخیل ہوتے وقت اپنی ہیئت اور شکل بدل لیتے ہیں وہ ''تدبھو'' ہوتے ہیں یا یوں کہیں تو درست ہوگا کہ ثقافت جو نسل در نسل عمل و تعمل کا ایک ایسا تسلسل ہے جس میں زبان ایک اہم کردار ادا کرتی ہے اور اس تسلسل کے بارے میں ایک جگہ سبطِ حسن نے کہا تھا کہ: ''تہذیب انسان کا سفر ہے اور موجود سے ممکن تک۔'' جب کہ ڈاکٹر عطش دُرّانی اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ: ''تہذیب کی بنیاد کلچر ہے۔بات لفظ تہذیب کی ہو یا کلچر یا ثقافت کی، ساختیاتی حوالے سے زبان کی نمائندگی کرتے ہیں۔زبان کسی بھی ثقافت کی وہ پہچان ہے جو کلچر کے مثبت و منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ثقافت کے دائرے میں جہاں زندگی بسر کرنے کے عوامل کی گوشماری ہوتی ہے تو اس میں زبان بھی شامل فہرست ہے۔'' جیسا کہ ڈاکٹر جی اے الانا لکھتے ہیں:

> ''مقامی زبانیں اور بولیاں بھی ثقافت کے مطالعے کے دائرے میں آجاتی ہیں کیوں کہ وہ لوگوں کے خیالات، اظہار، سوچ بچار، تخیل اور ذہنی ارتقا کے مطالعے میں مددگار ہوتی ہے۔اس لیے ثقافت ایک طرف انسان کی مادی زندگی کے لیے ضروری اشیاء، اوزار، اسلحہ، لباس اور رہایش وغیرہ سے واسطہ رکھتی ہے اور دوسری طرف غیر مادی یعنی روحانی زندگی سے متعلق چیزوں، جیسا کہ زبان، علم وادب، فن، مذہب، اخلاق اور قانون سے بھی نسبت رکھتی ہے۔''[۳۴]

یہاں پر اگر یہ وضاحت کر دی جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ زبان، علم وادب، فن اور قانون کا تعلق روحانی زندگی سے کہیں زیادہ انسانی ادراک سے ہے کیوں کہ روحانی زندگی کا تعلق مذہب و اخلاق سے تو ہو سکتا ہے مگر فن کی تخلیق میں یا زبان کی تخلیق کے بعد اس کی ماہیت و ساخت کے لیے ادراک اور شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔جو مادی ماحول میں مادی ذرائع ابلاغ مہیا کرتے ہیں جن میں خود ثقافت بھی ایک پہلو ہے۔کیوں کہ زبان کی ساخت و پرداخت اور نشوونما انسانی ماحول کرتا ہے جو ثقافت میں گُندھا (Intertwined/Amalgam) ہوا ہوتا ہے۔ثقافت آواز کو لفظوں کا ڈھب سکھاتی ہے اور نشانات (Words) کی صورت گری کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ تحقیقی اور ساختیاتی مطالعے میں کسی بھی زبان کا ثقافتی پس منظر سب سے زیادہ زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔کیوں کہ ثقافت اور زبان لازم و ملزوم اور 'Amalgam' ہیں۔کسی بھی قوم کی ثقافتی تشکیل اور اس کی بقا اس قوم کی زبان میں ہوتی ہے۔زبان کلچر کے اظہار کا نہ صرف ذریعہ ہے بلکہ کلچر کے ساتھ جب علم وادب کو جوڑتی ہے تو دیگر اقوام کے ساتھ مقابلے کی صف میں آجاتی ہے۔کلچر کو جب اقتصادیات و سماجیات کے ساتھ آگے بڑھاتی ہے تو قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔زبان جب کلچر کو مذہب کے ساتھ متصل کرتی ہے تو قوم روحانی و اخلاقی درجات پا لیتی ہے۔زبان جو کلچر و معاشرت کی پیداوار ہے۔سوچ، تخیل، ارادے اور عمل کو شناخت عطا کرتی ہے۔ادب پر جب بھی بات ہوگی اس میں کلچر زبان کے ساتھ جڑا ہوا پایا جائے گا۔محمد منشا یاد تو ادب کو کلچر کا مرہونِ منت گردانتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''وہ تمام ادب جسے کسی پاکستانی شہری نے تخلیق کیا ہو، پاکستانی ادب ہے خواہ وہ پاکستان میں بولی جانے والی کسی زبان میں ہو اور اس کا موضوع کچھ بھی ہو۔وہ تمام ادب جس کی جڑیں پاکستان کے جغرافیائی اور ثقافتی وجود میں

گہری ہیں اور وہ ادب جو پاکستان بننے سے پہلے برصغیر کے مسلمانوں نے لکھا، ہماری گراں قدر میراث اور ہماری ادبی روایات کا حصہ ہے۔ پاکستانی ادب میں اس مٹی کی بوباس ہے...اس کے ساتھ ساتھ اس کا برصغیر کی مسلم فکر و کلچر اور فنی روایت سے گہرا رشتہ ہے۔'' ۳۵

اب عکسی مفتی نے اسے یوں کہا ہے:

"The varied regional cultural heritage of Languages, Literature, folk lore has been repressed or altogather ignored. The language of the popular lore may differ yet the message is common."۳۶

ترجمہ: فوک کہانی، جو بہت سے علاقائی ثقافتی زبان وادب کی تاریخی میراث ہے، کونمو سے روکا گیا یا مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ فوک کہانی کی زبان مختلف ہو سکتی ہے لیکن اس میں پایا جانے والا پیغام یکساں ہوتا ہے۔

ثقافت اور تحریک:

اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر زبان اپنے معاشرے کے فکر و خیال کی ترجمانی کرتی ہے۔ جب ثقافت کا مطالعہ کرتے ہیں تو گویا زبان کا مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس مطالعہ سے مراد زبان کے قواعد و صوتیات کا مطالعہ نہیں ہے۔ بلکہ زبان اپنے ساتھ جو ثقافتی عناصر لے کر آتی ہے دراصل اس کا مطالعہ کیا جا رہا ہوتا ہے۔ جمائی آنے پر جب زبان سے بے ساختہ 'لاحول ولاقوۃ'' نکلتا ہے تو بلاواسطہ ثقافت کے بے شمار پہلوؤں کو آشکار کیا جا رہا ہوتا ہے۔ جو ہماری اپنی ثقافتی تاریخ کے ماخذ کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ جس طرح منطق اور فلسفے کو ثقافت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ثقافت، تہذیب اور تمدن کے فروغ میں مذہب نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کی تحریک نے مسلمانوں کی ثقافت اور تمدن سے مل کر مؤثر کام کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ نفرت کا اظہار ان کی ابتدائی تحریروں سے بھی ملتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ہندوستان پر تسلط جو مغلوں کے دورِ زوال کے بعد ہندو مسلم مناقشہ ایک نئی صورت اختیار کر گیا۔ ویسے بھی انگریز حکومت کو بحیثیت مجموعی ہندوؤں کے مقابلے میں کئی وجوہات کی بنا پر مسلمانوں سے زیادہ ہی پرخاش تھی۔ ۱۹۳۵ء میں انگریز سرکار نے فارسی کی بجائے انگریزی کو تعلیم اور انتظامیہ کی زبان قرار دیا۔ جس سے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ ہندو فطرتاً طالع آزما تھا۔ اس نے انگریزی کی تعلیم کو لاگو کرنے کی حمایت کی اور فارسی کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر انگریز حکومت کی حمایت حاصل کر لی۔ اس کا مطلب مسلمانوں کو اپنے ثقافتی ورثے کو چھوڑ کر ایک غیر ملکی ثقافت کو اپنانے پر مجبور کرنا تھا۔ یہاں سے دو قومی نظریے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس سے ہندوستانی مسلم قوم کی علاقائی خود مختاری کے مطالبے کی تحریک شروع ہوئی۔ ۳۷

یہ ثقافتی تحریک جو دنیا کے نقشے پر ابھری۔ ایک ایسی ثقافت تھی جو طویل مدت سے منصوبہ بندی کی مرہونِ منت تھی۔ جسے اپنی تعمیر و ترقی کے لیے ایسے ادب و فلسفہ اور تشہیر کی ضرورت تھی جو آخر کار پوری ہوئی۔

لیکن یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ تہذیب کے ضمن میں آنے والی بہت سی ایجاد کردہ اشیاء ثقافت کے براہِ راست فروغ میں اہمیت رکھتی ہیں۔ جو تحریک کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ مثلاً جدید دور میں پیداواری صلاحیت کا بے پناہ اضافہ ثقافت کے براہ راست فروغ میں حائل ہوتا ہے جس سے ثقافتی تحریکیں متاثر ہوتی ہیں۔ کچھ ہندو طبقوں نے اسلامی ثقافت کی نفاست سے متاثر ہو کر مسلم ثقافت کو اپنا لیا تھا۔ ان ہندوؤں میں کایستھ، کھتری اور کشمیر کے پنڈت اور سندھی عالم شامل ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی زبانوں اور ادب میں حصہ لیا اور مسلم انتظامیہ میں شریک کار رہے۔ اپنی خانگی زندگی بھی اسلامی طرزِ معاشرت کے مطابق ڈال لی۔ ۳۸

اس سلسلے میں ماضیکیک مثال اس طرح ثبت ہے:

یہ ایک طرح کی سماجی ترقی کی تحریک تھی جیسی کہ آج کل برصغیر کی اشرافیہ مغربی ثقافت و تمدن اپنائے ہوئے ہے۔ مذہبی اختلاف کے سوا ان لوگوں کی اشرافیہ مغربی ثقافت میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہمارے سامنے ایک مثال یہ ہے کہ ان غیر مسلمانوں کی اشرافیہ کے ادیب اور شاعر حضرات امام حسین کی شہادت کے موضوع پر مرثیہ لکھتے ہیں۔ جو ہماری لائبریریوں میں موجود ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان میں کچھ لوگوں نے اسلامی نام بھی رکھ رکھے ہیں۔ جیسے پرویز سنگھ سندھو، رام ریاض، فیروز چند محبوب کرن وغیرہ۔ مگر کٹر پنتھی ہندو اپنی ایسی اشرافیہ کے خلاف تھی۔ وہ اپنی مذہبی اجارہ داری پر اس کو ایک ضرب سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہندوؤں میں چار طبقے پیدا کر رکھے تھے۔ جن میں ذات پات، نیچ ذات، اونچی ذات اور مذہب پرستی۔ ان طبقاتی جکڑ بندیوں کی وجہ سے چھوٹی ذات کے لوگ پریشان تھے۔ بھگت کبیر نے ذات پات کی بندش سے ان لوگوں کو آزاد کرانے کی تحریک شروع کی جو بھگتی تحریک کہلائی۔ جو اسلامی اصولوں کے قریب تر تھی۔ ۳۹

ثقافت ایک ایسا دریا ہے جو درجنوں ندی نالوں کو تحریکوں کی شکل میں آگے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتا ہے۔

تہذیب و ثقافت، ثقافت اور مذہب، ثقافت اور زبان و ادب پھر ثقافت و تحریک کے ربط میں زندگی کا تسلسل پنہاں ہے کیوں کہ ادب کا تعلق انسان، ان کی سوچ اور گرد و پیش کے ماحول سے ہے۔ جس ماحول میں ثقافت نمو پذیر ہوتی ہے۔ اس کی نمائندگی جہاں انسان اور انسانی عمل و تعمل ہے وہاں اس کی زبان قلعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاشرتی منظّم نظام میں زبان وہ واحد عنصر کلی ہے جو طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ ثقافت کو اگر معاشرتی نظاموں کا مجموعہ کہا جائے تو زبان میں ربط کا کام سرانجام دیتی ہے۔ نظاموں میں جس طرح کا رنگ اور خاصیت ہوتی ہے ربط (زبان) کا رنگ بھی ویسا ہی نظر آنے لگتا ہے۔ ثقافتی نظاموں میں تبدیلی دراصل معاشرتی سوچ کی تبدیلی ہے جو کہ مختلف نظریات میں امتیاز پیدا ہونے پر سامنے آتی ہے۔ یعنی سوچ نظریے اور عمل میں تبدیلی جو ثقافت سے جڑی ہوتی ہے کسی نئے تحرک کا پیش خیمہ بنتی ہے جس کو زبان لفظوں کی صورت تحریر کا آہنگ عطا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے انسانی معاشرے میں سوچ کی تبدیلی جو نئے نظریات کو جنم دیتی ہے دراصل انسانی ثقافتی عناصر (Elements) کا تصادم ہے

جسے عام طور پر تحریک کہا جاتا ہے۔ ثقافتی نظام جس میں روزمرہ زندگی، رہن سہن، خوراک، گزر اوقات وطریقہ ہائے معاش، رِیت رواج، رسومات، زبان، علم وادب، ذرائع آمد ورفت وغیرہ شامل ہیں۔ جس نظام میں بھی جمود کی فضا پیدا ہوتی ہے اس کھوکھلی خلا (Holloness) کو پُر کرنے کے لیے جو بھی تسلسل سے ہٹ کر تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ دراصل تحریک ہے۔

دوسری صورت میں نظام کے تسلسل میں مدمقابل کسی نئی تبدیلی کی قبولیت (جسے معاشرہ من وعن یا چنداں تبدیلی کے ساتھ قبول کرتا ہے) ایک تحرک ہے جس کا اظہار انسانی زبان، ادب یا معاشرت جب کرتی ہے تو ثقافت اس میں رَچی بَسی ہوتی ہے۔ مثلاً جب پاکستانی ادب میں رومانیت پر حقیقت نگاری کو ترجیح دی گئی تو اس کی مثالیں نہ صرف پاکستانی معاشرے سے دی گئیں جو اس کی ثقافت کا عکس ہیں بلکہ اس کے کردار بھی تو اسی ثقافت کے نمائندہ کردار ہیں جہاں سے ادب اور پھر اس کی مثالیں منتخب کی گئیں۔ گویا ادب، وجہِ تخلیقِ ادب، زبان، ادبی تبدیلی یا الفاظِ دیگر ادبی تحریک اس میں موجود عناصر کا تعلق متعلقہ ثقافت سے ہوتا ہے کیوں کہ یہ پہلے ہی بیان ہو چکا کہ ثقافت کوئی ساکت (Static)، غیر متحرک، جمود (Inertia) نہیں بلکہ ثقافت انجذاب کا نام ہے جو تبدیلی قبول کرتی ہے، تبدیل ہوتی ہے اور معاشرے میں انفرادیت کے ساتھ تبدیل ہونے کی خاصیت رکھتی ہے۔ جس کو قدرے اختصار کے ساتھ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیان کیا ہے کہ:

> ''زبان کلچر کی اہم ترین علامت ہے۔ جیسا کلچر ہوگا ویسی ہی زبان ہوگی۔ جیسی زبان ہوگی ویسا ہی کلچر ہوگا۔ زندہ زبان معاشرتی تقاضوں سے وجود میں آتی ہے اور خیال اور احساس کے ایسے نظام کو جنم دیتی ہے جس کے ذریعے زبان کا تعلق معاشرے کے مختلف طبقوں سے یکساں ہو جاتا ہے جس میں تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ، ادنیٰ اور اعلیٰ چھوٹے اور بڑے سب یکساں طور پر اپنی اپنی ضرورت اور صلاحیت کے مطابق شریک ہوجاتے ہیں۔''[۴]

جب مختلف طبقوں کے لوگ ثقافتی میل جول کے ساتھ کسی معاشرتی تبدیلی کا حصہ بنتے ہیں اور زبان ان کو شناخت دیتی ہے تو ہر دفعہ ایک نئی خاصیت سامنے آتی ہے۔ یہی خاصیت دراصل نئی بات، نئی تبدیلی اور تحریک ہے جو کسی نئی زبان کا پیش خیمہ بن کر موجود جمود کو توڑ دیتی ہے۔

دوسری طرف ثقافت کی تشکیل کو مدنظر رکھتے ہوئے ثقافتی نظام سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ثقافتی پس منظر کے تحت زبان لفظوں کی صورت گری کرتی ہے۔ ثقافتی ضروریات اور ثقافتی نظام میں تبدیلی دراصل زبان میں تبدیلی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ وہی تبدیلی ثقافت کے ایک نظامِ علم وادب سے جب متصادم ہوتی ہے تو اسے بھی متحرک کر دیتی ہے جو کسی نئے موضوع کو جنم دے کر نئی تحریک کا جواز مہیا کرتی ہے۔ چوں کہ ثقافت بھی ایک تغیر پذیر شے ہے، اس لیے زبان وادب بھی متغیر ہو کر ہی قائم رہ سکتے ہیں۔

حواشی:

١۔ بحوالہ: عطش دُرّانی، اسلامی فکر وثقافت، لاہور، مکتبہ عالیہ، طبع دوم، ۱۹۸۷ء، ص۷۰۔

٢۔ بحوالہ: عطش دُرّانی، ایضاً، ص۷۰

٣۔ امجد علی، سید، ثقافتی زرِمبادلہ، مشمولہ: ثقافت (سہ ماہی)، شمارہ نمبر۱، اسلام آباد، لوک ورثہ، ۱۹۷۵ء، ص۶۶۔

٤۔ زوار حسین، تہذیب، ملتان، شرجیل پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۰ء، ص۴۴۔

5. Uxi Mufti, Cultural Horison of Pakistan, Islamabad: National Book Foundation, May, 2017, P.179

۶۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز (مرتبہ)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۵۴۔

۷۔ فیض احمد فیض، میزان، لاہور، منہاس سٹریٹ پیسہ اخبار (طبع اول)، فروری ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۔

8. Hornby, S. and Others, The Advance Learner Dictionary of English, London: Oxford University Press, 1963, P.238

9. Carter, V. Good, Dictionary of Education, New York: MC Graw Hill, Inc, New York, MC Millan Company, 1960, P.350

۱۰۔ فیض احمد فیض، میزان، ص: ۱۵۔

۱۱۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۸۔

۱۲۔ اے۔ کے۔ سی۔ اوٹاوے، تعلیم، سماج اور کلچر، ترجمہ: اختر انصاری، لاہور بک ہوم، ۲۰۰۵ء، ص ۲۸۔

۱۳۔ غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، جولائی ۱۹۸۷ء، ص ۴۸۔

۱۴۔ قرآن کریم، پارہ نمبر ۳۰، سورۃ والتین، آیت نمبر ۴، تفسیر ابن کثیر، جلد ۸، لاہور، ص ۵۶۲۔

۱۵۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، کراچی، کتاب پرنٹر لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۔

۱۶۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، مرتبہ: شیما مجید، کراچی، فیروز سنز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۔

۱۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، کلچر اور پاکستانی کلچر، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ: ڈاکٹر رشید امجد، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۷۔

18. Jawahar Lal Nehru, Letters from a Father to a Doughter, Allahabad: 1938, P:36

۱۹۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۴ء، ص ۶۷۔

۲۰۔ عماد الحسن فاروقی، اسلامی تہذیب و تمدن، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۔

۲۱۔ قرآن کریم، پارہ ۲۰، سورۃ القصص، آیت ۵۹، مرتبہ ابن کثیر، جلد ۷، ص ۱۲۳۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۲۳۔ غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، ص ۴۷۔

۲۴۔ محمد اکرم شیخ، ثقافتی ورثے کی فوقیت، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ، ڈاکٹر رشید امجد، ص ۴۵۔

۲۵۔ فیض احمد فیض، میزان، لاہور، پیسہ اخبار سٹریٹ، ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۔

۲۶۔ عماد الحسن فاروقی، اسلامی تہذیب و تمدن، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۔

۲۷۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ: ڈاکٹر رشید امجد، ص ۱۲۴۔

۲۸۔ ممتاز حسین، ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت کی میراث، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ: ڈاکٹر رشید امجد، ص ۱۶۱۔

۲۹۔ بحوالہ: عطش دُرّانی، اسلامی فکر و ثقافت، ص ۷۵۔

30. Uxi Mufti, Cultural Horison of Pakistan, P.187

۳۱۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص ۲۴۴۔

۳۲۔ غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، ص ۵۱۔

۳۳۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، رنگِ ثقافت، مشمولہ: اردو زبان، شمارہ ۹، الہ آباد، ذیشان پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷۔

۳۴۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، رنگِ ثقافت، مشمولہ: اردو زبان، شمارہ ۹، ص

۳۵۔ محمد منشا یاد، پاکستانی ادب کا مستقبل (ماضی اور حال کے آئینے میں)، مشمولہ: ادبی جائزے، مرتبہ: خالد اقبال یاسر، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص ص ۱۰۰، ۱۰۱۔

36. Uxi Mufti, Cultural Horison of Pakistan, P.196

۳۷۔ علامہ اقبال، اقبال کا صدارتی خطبہ، آزادی جدوجہد الہ آباد، کراچی، مسلم لیگ کا اجلاس، ۱۹۵۸ء، ص ۱۶، ۱۷۔

۳۸۔ عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی کلچر، ترجمہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۶۔
۳۹۔ پرمانند، کبیر پنتھ، مدراس، وجے نگر روڈ، س ن، ص ۱۶۱۔
۴۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع دوم، ۱۹۸۵ء، ص:۱۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ الانا، غلام علی، ڈاکٹر: ۱۹۸۷ء، ''زبان اور ثقافت''، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، لاہور۔
۲۔ اے۔ کے۔ سی۔ اوٹاوے: ۲۰۰۵ء، ''تعلیم، سماج اور کلچر''، مترجم: اختر انصاری، بک ہوم، لاہور۔
۳۔ پرمانند: س ن، ''کبیر پنتھ''، مدراس۔
۴۔ تفسیر ابن کثیر، جلد نمبر ۷، قرآن کریم پارہ ۲۰، سورۃ القصص، آیت ۵۹، لاہور۔
۵۔ ________، جلد نمبر ۸، قرآن کریم پارہ نمبر ۳۰، سورۃ والتین، آیت نمبر ۴، لاہور۔
۶۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر: ۱۹۸۵ء، ''پاکستانی کلچر''، طبع دوم نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔
۷۔ حسین، زوار: ۲۰۰۰ء، ''تہذیب''، شرجیل پرنٹنگ پریس، ملتان۔
۸۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز (مرتبہ): ۱۹۸۵ء، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔
۹۔ درّانی، عطش: ۱۹۸۷ء، ''اسلامی فکر و ثقافت''، طبع دوم، مکتبہ عالیہ، لاہور۔
۱۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر: ۱۹۹۹ء، مرتب، ''پاکستانی ثقافت''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔
۱۱۔ سبط حسن: ۱۹۷۵ء، ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء''، کتاب پرنٹر لمیٹڈ، کراچی۔
۱۲۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر: ۱۹۷۷ء، ''کلچر کا مسئلہ''، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔
۱۳۔ علامہ اقبال، ۱۹۵۸ء، ''اقبال کا صدارتی خطبہ''، کراچی۔
۱۴۔ عزیز احمد: ۱۹۹۷ء، ''برصغیر میں اسلامی کلچر''، ترجمہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، دارہ ثقافت اسلامی، لاہور۔
۱۵۔ فاروقی، عماد الحسن: ۱۹۹۶ء، ''اسلامی تہذیب و تمدن''، نگارشات، اسلام آباد۔
۱۶۔ فیض احمد فیض: ۱۹۶۲ء، ''میزان''، طبع اوّل، پیسہ اخبار، لاہور۔
۱۷۔ ________ ۱۹۸۸ء، ''پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش''، مرتبہ، شیما مجید، فیروز سنز، کراچی۔
۱۸۔ ملک، حسن، مظفر، ڈاکٹر: ۲۰۰۴ء ''ثقافتی بشریات''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔
۱۹۔ یاسر، اقبال، خالد: ۱۹۸۶ء، مرتب، ''ادبی جائزے''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

20. Carter, V. Good, Dictionary of Education, New York: MC Graw Hill, Inc, New York, MC Millan Company, 1960.
21. Hornby, S. and Others, The Advance Learner Dictionary of English, London: Oxford University Press, 1963.
22. Jawahar Lal Nehru, Letters from a Father to a Doughter, Allahabad: 1938.
23. Uxi Mufti, Cultural Horison of Pakistan, Islamabad: National Book Foundation, May, 2017
24. Uxi Mufti, Cultural Horison of Pakistan.
25. Uxi Mufti, Cultural Horison of Pakistan.

مجلّات:

۱۔ ماہ نامہ ''اردو زبان''، شمارہ ۹، الہ آباد، انڈیا۔
۲۔ سہ ماہی، ''ثقافت''، ۱۹۷۵ء، شمارہ نمبر ۱، لوک ورثہ، اسلام آباد۔